بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ترجمان القرآن میں دوسرے رسائل کی طرح کتابوں پر تبصرہ بالعموم "مطبوعات" اور "تعارفِ کتب" کے تحت کیا جاتا ہے۔ مگر اس مرتبہ ہم اپنی عام روش سے ہٹ کر اشارات میں ایک کتاب پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ یہ نہیں کہ اس کتاب میں ایک سربراہِ مملکت کے ذاتی تاثرات قلمبند ہیں یا یہ کتاب علمی اور دینی اعتبار سے کسی غیر معمولی توجہ کی محتاج ہے، بلکہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جس کے ہاتھ میں نہ صرف یہ کہ اس وقت ملک کے پورے سیاہ و سپید کا اختیار ہے بلکہ جس کے ذہن میں اس ملک کو ایک خاص نہج اور انداز پر چلانے کا منصوبہ اور نقشہ بھی ہے، اور وہ اس کتاب میں بڑی حد تک ظاہر کر دیا گیا ہے۔ جب اس ملک کے باشندوں کو ایک ہمہ مقتدر سربراہ پوری قوت کے ساتھ ایک خاص راستہ سے خاص نصب العین کی طرف بڑھانے کا عزم رکھتا ہے، اور جب وہ قوم کی فلاح و بہبود اور ملک کی سربلندی کے لیے اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے، تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ملک کے عوام اس رہنما کی شخصیت، اس کے عزائم اور اس کے طرزِ فکر کو پوری طرح سمجھیں۔ کیونکہ یہ ساری چیزیں خود ان کی زندگی پر شدّت سے اثر انداز ہونے والی ہیں، ان کے فکر و نظر کے زاویے اور عمل کے میدان متعین کرنے میں اِن کو زبردست حصّہ لینا ہے، اور اُن کی سیرت و کردار کو مخصوص سانچے میں ڈھالنے اور اُن کی قوتوں اور صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی ایک خاص راہ پر ڈالنے میں نہایت گہرے طور پر ان کو اثر انداز ہونا ہے۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کی یہ سوانح جو حال ہی میں "فرینڈز ناٹ ماسٹرز،"

" (FRIENDS NOT MASTERS) کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس ملک کے باشندوں کے لیے اس وجہ سے بھی بڑی اہم اور قابلِ توجہ ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی تصریحات پر مشتمل ہے جو تقسیمِ ملک کے وقت بونڈری فورس کے ایک افسر سے لے کر آج سربراہِ مملکت کی حیثیت تک اس ملک کے بناؤ و بگاڑ میں براہِ راست یا بالواسطہ کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہا ہے۔ جب تقسیمِ ملک کا نازک مرحلہ درپیش تھا اور بھارت خصوصاً مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے خون سے ہندو اور سکھ ہولی کھیل رہے تھے ، عفت مآب بیٹیوں پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے اس وقت جناب محمد ایوب خاں صاحب کو میجر جنرل ریس کے ساتھ پاکستان کی طرف سے مشیر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد وہ وزیرستان میں ایک بریگیڈ کے انچارج بنا دیئے گئے پھر انہیں مشرقی پاکستان کا جی۔ او۔ سی مقرر کیا گیا ـــــ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں کمانڈر ان چیف کے منصب کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی۔ کچھ مدت وہ اس کے ساتھ ساتھ وزیرِ دفاع بھی رہے۔ پھر سکندر مرزا کے ساتھ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا انقلاب برپا کرنے میں شریک ہوتے۔ اور اس کے چند روز بعد بالآخر پورے ملک کے سیاہ و سپید کے مالک ہو گئے۔ جو شخص ملکی معاملات سے اتنا قریب، یا اُن میں اتنا دخیل رہا ہو، وہ جب اپنے زمانۂ اقتدار ہی میں اپنی سوانح لکھے تو لامحالہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ خود نوشت سوانح عمری لوگوں کو اُس ذہن کے سمجھنے میں مدد دے گی جو اب تک کے حالات میں کارفرما رہا ہے اور آئندہ ایک مدت تک کارفرما رہنے والا ہے۔ اِسی بنا پر جب اخبارات میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ ملک کی اتنی اہم اور فعال شخصیت اپنی سیاسی زندگی کی داستان مرتب کر رہی ہے تو اس ملک کے پڑھے لکھے طبقے میں اس کے لیے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ بڑی بے تابی کے ساتھ اس کی اشاعت کا انتظار کرنے لگا۔

اس کتاب کی جو پذیرائی ہوئی ہے وہ قطعاً غیر متوقع نہیں۔ ریڈیو اور پریس میں اس کا اچھا خاصا چرچا کیا گیا اور مداحوں اور خیر خواہوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کی مدح و توصیف کی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مداح فیلڈ مارشل ایوب صاحب کا دورِ اقتدار گزر جانے کے بعد بھی ایسی ہی باتیں کریں گے یا اس وقت ان کا طرزِ کلام کچھ اور ہو گا۔ ہماری نظر میں ان لوگوں کی رائے اور ان کے اندازِ ستائش کی اس وجہ سے

کوئی وتعجب نہیں کہ اس قماش کے لوگوں کا یہ معاملہ صرف صدر ایوب صاحب کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ یہ اس سے پہلے بھی ہر صاحبِ اختیار کے افکار و اعمال کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہے ہیں۔

اب تک اس کتاب کے بارے میں اندرونِ ملک صورتِ حال یہ ہے کہ جو کچھ شائع ہو رہا ہے اس کی طرح وستائش میں شائع ہو رہا ہے۔ اِن حالات میں اس کے مندرجات کے کسی حصے سے اختلاف کرنا۔ یا اس کے کسی پہلو پر حرف گیری کرنا کوئی خوشگوار کام نہیں مگر ہم دیانتداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ کتاب میں بعض ایسی باتیں ہیں جو یا تو وضاحت طلب ہیں یا جن کے بارے میں دل کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکا۔

چونکہ یہ صدر ایوب صاحب کی سیاسی سوانح ہے اس لیے انہوں نے اپنی ذاتی اور نجی زندگی کے حالات کو اختصار کے ساتھ چند صفحات میں بڑی کامیابی کے ساتھ سمیٹ دیا ہے۔ تاہم یہ بھی نتیجہ خیز معلومات سے خالی نہیں ہے۔ ان کے ایامِ طفلی کے بعض واقعات، مثلاً چھوٹے بھائی کی پیدائش پر اُن کا ردِ عمل اور مسجد میں مولوی صاحب کے ساتھ اُن کا معاملہ، اُن کے مزاج، ان کی افتادِ طبع اور اُن کے رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں، اور نفسیات کے طالب علم کے لیے دلچسپی کے موجب ہیں۔ مگر اہلِ پاکستان کے لیے دلچسپی کا اصل موضوع ان کی سوانح حیات کا وہ حصہ ہے جس میں ان کی زندگی کا تعلق ملّت اور اس کے معاملات کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اور اس کا نقطۂ آغاز ۱۹۴۷ء کا زمانہ ہے جب تقسیمِ ملک کے وقت انہیں پنجاب بونڈری فورس میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے شامل کیا گیا تاکہ وہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو بچانے اور وہاں سے بحفاظت پاکستان پہنچانے کے لیے تگ و دو کریں۔ درحقیقت یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اُن کی قومی اور ملّی خدمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے خواہ انہوں نے کتنی ہی جانفشانی کے ساتھ اپنے فرائض کو ادا کیا ہو، بہرحال دینی اور ملّی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ وہ جس فوج سے وابستہ تھے وہ انگریزی استعمار کے حفظ و بقا اور توسیع و ترقی کے لیے تشکیل کی گئی تھی۔ اُن کی زندگی کا غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں اپنی قوم، اپنی ملّت اور اپنے

ملک کی خدمت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ میرے ہی تاثرات نہیں بلکہ صدر مملکت کے اپنے احساسات بھی یہی ہیں اور اسی بنا پر یہاں سے اُن کے طرزِ استدلال اور اسلوبِ نگارش میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس سے پہلے کے واقعات کو اُنہوں نے بغیر کسی تکلّف کے جُوں کا تُوں بیان کر دیا ہے کسی ایک واقعہ کی بھی توجیہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مگر یہاں سے وہ اپنے ہر فعل اور عمل کو صحیح اور برحق ثابت کرنے کے لیے دلائل لاتے ہیں اور اُس کے بارے میں ان مختلف شکوک و شبہات کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اندازِ تحریر بونڈری فورس کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔

انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ فورس اپنوں اور غیروں کی ملامت کا ہدف بنی ہے اور اس بنا پر اُن کی ذات بھی تنقید کی زد میں آتی ہے اور لوگ اس معاملے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اس بارے میں انہوں نے بالکل معذرت خواہانہ موقف اختیار کیا ہے اور یہ کہہ کر لوگوں کو مطمئن کرنا چاہا ہے کہ انہیں اس فورس میں کوئی زیادہ اختیارات حاصل نہ تھے کیونکہ اُن کی حیثیت بس ایک مشیر کی سی تھی۔ صدر صاحب خود اس فورس کی بے بسی کے بھی قائل ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے سر فرانسس ٹکر کی کتاب WHILE MEMORY SERVES اور مون کی کتاب DIVIDE AND QUIT کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔

اس ضمن میں جو مختلف کتابیں شائع ہوئی ہیں انہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فورس اس وجہ سے بے بس نہ تھی کہ اس کی تعداد کم تھی یا اس کے پاس ضروری سامان نہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ جس انگریز کے ہاتھ میں اس کی کمان تھی اُسے اس ملک کے باشندوں کی جان و مال کی حفاظت سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

THE LAST DAYS OF BRITS-RAJ کا مصنف اس فورس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "بونڈری فورس جس کی یکم اگست کو تشکیل کی گئی، پچاس ہزار افسروں اور سپاہیوں پر مشتمل تھی غالباً یہ سب سے بڑی فوجی قوت تھی جسے شہری آبادیوں میں امن قائم کرنے کے لیے کبھی مجتمع کیا گیا تھا" (ص ۲۰۹)

صدر ایوب صاحب نے اُن لرزہ خیز مظالم کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں پر ڈھائے جا رہے تھے۔ وہ ان کی بے کسی اور بے بسی پر متاثر بھی نظر آتے ہیں۔ مگر امرتسر اور اس کے گرد و نواح کے مسلمانوں کی ایک تعداد کو پاکستان پہنچانے اور لیاقت علی خاں کو یہ اطلاع دینے کے سوا کہ دس لاکھ سے اوپر مہاجرین پاکستان آ رہے ہیں، ان کا کوئی دوسرا کارنامہ اس کتاب میں سامنے نہیں آتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس درندگی اور بہیمیت کے دور میں بھی انسانیت اور آدمیت کے بہی خواہوں نے جن میں ہر قوم اور فرقے کے لوگ شامل تھے مظلوموں کی جانیں بچانے کے لیے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اُن کی تفصیلات جب کتابوں اور اخبارات میں نگاہ سے گزرتی ہیں تو قدرتی طور پر ذہن یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ بونڈری فورس میں پاکستان کے فوجی نمائندے نے جو اپنی ساری مجبوریوں کے باوجود مظلوموں کی حمایت کے لیے عام افراد سے بہرحال زیادہ وسائل رکھتا تھا، کیا کیا۔ ان تفصیلات کے بغیر یہ باب تشنہ معلوم ہوتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد جناب محمد ایوب خاں صاحب کو مشرقی پاکستان کا جی۔ او۔ سی مقرر کیا گیا تاکہ وہ اُس حصّہ میں فوج کو مضبوط بنائیں۔ وہاں کی سیاسی صورتِ حال اور سیاستدانوں کی سر پھٹول سے وہ سخت رنجیدہ ہوتے اور انہیں یہ دیکھ کر دکھ ہوُا کہ وہاں کوئی تعمیری کام نہیں ہو رہا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کی حکومت پر زور دیا کہ وہ یہاں زیادہ سے زیادہ پبلک سکول کھولے۔ آہستہ آہستہ اُن کے روابط وہاں بڑھتے چلے گئے اور انہوں نے وہاں کے باشندوں کو اپنے حقوق کے حصوؔل کے لیے اس انداز سے تلقین کرنی شروع کی:

> "میں اپنے دوستوں سے اصرار کے ساتھ کہتا تھا کہ تم اپنی حکومت پر زور دو کہ وہ تمہارے لیے کچھ کرے ورنہ تم دوڑ میں پیچھے رہ جاؤ گے۔ جاؤ اور اپنے موقف کو پیش کرو۔ جاؤ اور مغربی پاکستان والوں سے جھگڑا کرو اگر وہ تمہارے مفادات کے خلاف کچھ کر رہے ہیں۔ جاؤ اور مرکزی حکومت سے اپنے حقوق کے حصوؔل کے لیے لڑو۔ تم یہ سب کچھ ضرور کرو، مگر اس کے ساتھ اس بات پر بھی اصرار کرو کہ تمہارے نوجوان بچّوں اور بچّیوں کو مناسب تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ وہ

برابر کے شہریوں کی حیثیت سے اور ہر دوسرے انسان کی طرح اپنی ذمہ داریاں بہتر طور پر ادا کر سکیں۔" (ص۲۶)

یہ پند و نصائح اپنی جگہ بہت قابلِ قدر ہیں، اور ان سے محمد ایوب خاں صاحب کی انسان دوستی اور مشرقی پاکستان کے بھائیوں سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر غالباً انہوں نے ایک فوجی افسر کی حیثیت سے اپنے حدود کار کا تعین خود ہی کر لیا تھا۔ ورنہ یہ بات کم از کم ہمارے علم میں نہیں ہے کہ کسی علاقہ میں جنرل آفیسر کمانڈنگ کی حیثیت سے جو شخص مقرر کیا جائے اس کے فرائض میں یہ سیاسی کام بھی شامل ہوتا ہے۔

محمد ایوب خاں صاحب کی خود نوشت سوانح حیات کی رُو سے یہ پہلا موقع ہے جب ہم ان کو فوجی ملازمت کے اندر ملکی سیاست میں دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

صدر ایوب نے چوتھے باب میں بتایا ہے کہ کس طرح لیاقت علی خاں مرحوم کی حکومت نے سینیارٹی کو نظر انداز کر کے اہلیت کی بنیاد پر ستمبر ۵۰ء میں ان کو ملک کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف کی حیثیت سے نامزد کیا اور جنوری ۵۱ء میں انہوں نے اپنے نئے منصب کا چارج لیا۔ اس کے بعد پانچواں باب ہمارے سامنے آتا ہے جس کا عنوان ہے "سیاسیات ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک" اور یہ اس کتاب کا بہت اہم باب ہے۔ اس میں پاکستان کے ابتدائی ۱۱ سال کی جو کیفیت انہوں نے بیان کی ہے وہ بہت سے اندرونی حالات کا انکشاف کرتی ہے۔ اُس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خود ملکی سیاست سے کتنی دلچسپی تھی، ان کے اپنے رجحانات اس دَور میں کیا تھے، اور وہ کیا اسباب تھے جن سے ان کو بتدریج ملک کی سیاست میں فیصلہ کن دخل ہوتا چلا گیا۔

اس باب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں میدانِ سیاست کے بعض کھلاڑیوں سے بڑی ہمدردی تھی اور بعض کے وہ طبعاً خلاف تھے۔ ملک غلام محمد کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "وہ نہایت جری اور قطعی بے خوف آدمی تھا (ص۵۱)۔ ان کی رائے میں اُس وقت کی دستور ساز اسمبلی نے یہ بڑی بے جا حرکت کی تھی کہ جس دستوری رخنے سے فائدہ اٹھا کر غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا تھا اُس کو بند

کرنے کے لیے اسمبلی نے ۱۹۵۴ء میں چند دستوری ترمیمات کر دیں تاکہ گورنر جنرل آئندہ من مانی نہ کر سکے۔ اس سارے قضیے میں غلام محمد اور اسمبلی کے درمیان جو کشمکش برپا رہی، اس میں کمانڈر انچیف کی ہمدردیاں غلام محمد کے ساتھ تھیں، حتیٰ کہ اس حرکت پر کمانڈر انچیف نے دستور ساز اسمبلی کے صدر کو بُری طرح ڈانٹا بھی۔ (ص ۵)

اسی زمانہ کے واقعات کے سلسلے میں انہوں نے ایک دلچسپ قصہ بھی لکھا ہے۔ محمد علی بوگرہ، چوہدری ظفر اللہ خاں، چوہدری محمد علی اور کمانڈر انچیف امریکہ کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ ملک غلام محمد نے انہیں فوراً واپس آنے کا حکم دیا۔ جب یہ حضرات لندن کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو غلام محمد نے کمانڈر انچیف کو اس امر کی خاص ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد پاکستان پہنچیں۔ محمد علی بوگرہ حالات کی نزاکت سے واقف تھے۔ وہ راستے میں اپنے بچاؤ کے لیے کمانڈر انچیف کی جس طرح منت سماجت کرتے رہے وہ منظر بڑا دردانگیز ہے۔ ایک ملک کا وزیر اعظم فوج کے افسرِ اعلیٰ سے یہ ضمانت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اگر وہ اُسکے ساتھ اپنے ملک میں واپس جائے تو اسے گرفتار ہونے سے بچا لیا جائیگا۔ یہ ۵۴ء کی تصویر ہے جو بتا رہی ہے کہ اس وقت وزیر اعظم کی نظر میں اگر کوئی طاقت اُسے گورنر جنرل کی دستبرد سے بچا سکتی تھی تو وہ کمانڈر ان چیف کی طاقت ہی تھی۔

کراچی پہنچ کر سکندر مرزا، چوہدری محمد علی اور جناب محمد ایوب خاں صاحب ملک غلام محمد کے پاس گئے۔ وزیر اعظم کو صاحب گورنر جنرل کی پیشی میں لے جانا مناسب نہ سمجھا گیا۔ غلام محمد صاحب پر اس وقت بظاہر بلڈ پریشر کا "دورہ" پڑا ہوا تھا۔ چوہدری محمد علی صاحب نے محمد علی بوگرہ صاحب کے حق میں لب کشائی کی تو اُن پر گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ سکندر مرزا نے جرأت کی تو اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور یہ تینوں غلام محمد کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ جب یہ حضرات تشریف لے جا رہے تھے تو ایک نرس نے جناب محمد ایوب خاں صاحب کو کوٹ سے پکڑ کر غلام محمد کے پاس واپس ہونے کے لیے اشارہ کیا۔ اس کے بعد کی کیفیت وہ یوں لکھتے ہیں:

"میں واپس گیا تو میں نے اپنے سامنے ایک بالکل ہی دوسری شخصیت پائی۔ یہاں بوڑھے

بیمار گورنر جنرل کی جگہ، جو چند لمحے پہلے غصہ سے پاگل ہو رہا تھا، ایک ایسا شخص تھا جس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا اور وہ قہقہوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا "شریر بڈھا"! جن آنکھوں سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا اُن میں عجیب و غریب انبساط تھا۔ اُس نے مجھے اپنے بستر پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اپنے تکیہ کے نیچے سے دو دستاویزات نکالیں جن میں سے ایک میں لکھا تھا کہ "میں غلام محمد، اِن اِن وجوہات کی بنا پر یہ یہ اختیارات جنرل ایوب خاں کو دیتا ہوں اور ان کو حکم دیتا ہوں کہ وہ تین مہینے کے اندر ایک دستور بنا دیں۔"

جنرل ایوب نے اس شخص کی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے جو وجوہ انہوں نے بیان کیے ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ اُس وقت وہ فوج کو بنانے میں مشغول تھے، ہندوستان کے خطرے سے ملک کی حفاظت کرنے کے لیے فوج کو تیار کرنا مقدم کام تھا، اس صورت میں وہ ملک کی زیادہ بہتر خدمت کر سکتے تھے، اور ان حالات میں غلام محمد جلد بازی میں جو بے دھڑک اقدام کرنا چاہتا تھا وہ ملک کے لیے سخت نقصان دہ تھا۔ اِن وجوہ کے سوا کوئی اور وجہ انہوں نے بیان نہیں کی ہے۔ غالباً اُس وقت معاملہ کا یہ پہلو سرے سے ان کے ذہن میں آیا ہی نہیں کہ یہ بے ڈھب آدمی خواہ مخواہ فوج کو سیاست میں گھسیٹ رہا ہے، اور نہ اِس پہلو کی طرف ان کا ذہن متوجہ ہوا کہ یہ شخص جو بہر حال ایک ضابطہ و آئین کے تحت ہی ملک کا گورنر جنرل ہے، آخر کس قانونی اختیار سے ملک کے کمانڈر انچیف کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کے لیے خود ایک دستور بنا دے؟ اور کمانڈر انچیف جو کسی آئین و ضابطہ کے تحت ہی اُس کا ماتحت ہے، کیوں اس کے ایسے حکم کی تعمیل کرے؟ معلوم نہیں یہ پہلو ان کی نگاہ میں اہم نہ تھے، یا ویسے ہی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔

یہاں ایک سوال بار بار ذہن میں پیدا ہوتا ہے جس کا جواب نہیں ملتا۔ غلام محمد ایک مفلوج آدمی تھا جو چلنا پھرنا تو درکنار صاف بول بھی نہ سکتا تھا۔ صدر ایوب کی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بد مزاجی، بد زبانی اور سر پھرے پن سے سب لوگ نالاں بھی تھے۔ ان حالات میں یہ بات

سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر وہ طاقت کونسی تھی جس کے بل بوتے پر اقتدار کے ساتھ چمٹا رہا؟

غلام محمد نے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی توڑ کر نئی کابینہ کی تشکیل کی[۱] اور اس میں جناب محمد ایوب خان کو بڑے اصرار کے ساتھ بطور وزیر دفاع شامل کیا گیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے گورنر جنرل کے سامنے اس حقیقت کی پوری طرح وضاحت کر دی تھی کہ ان کی دلچسپی کا اصل مرکز فوج ہے، مگر اس کے باوجود انہیں بادلِ ناخواستہ یہ ذمّہ داری قبول کرنی پڑی، اور اس کے ساتھ وہ بدستور کمانڈر انچیف بھی رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ فوجی ملازمت کے دوران میں انہوں نے ایک سیاسی عہدہ سنبھالا اور سیاستدانوں کے دوش بدوش کام کیا۔ اپنے قریبی مشاہدات کی بنا پر انہوں نے اس سیاست باز گروہ کی ناعاقبت اندیشیوں اور مفاد پرستیوں پر بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ کس طرح کرسیوں کی خاطر اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو حالات و واقعات بیان کیے ہیں وہ بڑے عبرتناک ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ آج انہی عناصر کی ایک کثیر تعداد خود اُن کے گرد جمع ہے۔ جو حضرات اس وقت کنونشن لیگ میں شامل ہیں ان کی تاریخ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سابق پنجاب کی حد تک تو ہر ایک جانتا ہے کہ سر سکندر کے دورِ عروج میں یہ لوگ یونینسٹ تھے، پھر جب مسلم لیگ کو سیاسی اقتدار ملتا دکھائی دیا تو اس میں شامل ہو گئے۔ پھر سکندر مرزا نے جب ری پبلکن پارٹی کی سرپرستی فرمائی تو یہ اس کے سایۂ عاطفت میں آ گئے اور اب صدرِ محترم کے دورِ اقتدار میں جب کنونشن لیگ کا طوطی بول رہا ہے تو وہ اس کا راگ الاپنے میں مصروف ہیں۔

صدر صاحب نے خاصی تفصیل کے ساتھ حالات کی خرابی کا ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ملک میں عجیب و غریب قسم کا انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ حکومت نے عوام سے ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت نومبر ۱۹۵۷ء میں انتخابات کروانے کا وعدہ کیا، پھر وہ ۱۹۵۸ء پر ٹال دیئے گئے۔ صدر سکندر مرزا

اس آئین کی خامیوں سے پُورا پُورا فائدہ اٹھانے پر تُلا ہُوا تھا۔ اُس نے پُوری کوشش کی کہ جس شخص کا بھی ملک کی سیاسی زندگی سے کوئی تعلق ہے اُسے بالکل ننگا اور ذلیل و خوار کر کے رکھ دے۔ وہ درحقیقت انتخابات کروانا چاہتا ہی نہ تھا بلکہ دستور کو توڑ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور اس کے لیے اس نے اسٹیج تیار کر دیا تھا۔ دوسری طرف سیاست دانوں کے لیے خصوصاً پٹڑی سے اُترے ہوئے سیاست دانوں کے لیے انتخابات ہی کی راہ وہ ایک راہ تھی جس سے وہ سیاست کی وادی میں دوبارہ قدم رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ جوں جوں الیکشن کا وقت قریب آرہا تھا یہ حضرات آگ اُگلتے پھر رہے تھے۔ (ص ۵۶-۵۷)۔

اس ہنگامے کے دَور میں جنرل ایوب خاں صاحب کے تاثرات یہ تھے:

> ”انتخابات قریب آرہے ہیں۔ سیاست داں ہر قیمت پر برسرِ اقتدار آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مگر وہ خود جانتے ہیں کہ اقتدار میں آنے کے بعد اپنے ملک کو مزید برباد کرنے کے سوا وہ اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ اور اس صورت میں لازماً ان کا مجھ سے اور فوج سے براہ راست سامنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مجھے اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے ہیں۔ کیونکہ مجھے اپنا فرض انجام دینا ہے۔ ان لوگوں کا ضمیر اتنا مُردہ ہے کہ چند سیاسی فوائد کی خاطر وہ فوج کو بھی تباہ کرنے سے باز نہ رہیں گے۔“ (ص ۶۱)

یہ الفاظ صدر ایوب نے ۲۲ مئی ۵۸ء کی تاریخ میں نوٹ کیے ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ سیاست دانوں کو انتخابات کے ذریعہ از سرِ نو برسرِ اقتدار آنے کا موقع نہ ملنا چاہیے۔ اسی زمانہ میں کمانڈر انچیف کے عہدہ سے جناب ایوب صاحب کے ریٹائر ہونے کا وقت قریب آرہا تھا، مگر اُن کی خدمات کے پیشِ نظر جون ۱۹۵۸ء میں ان کی مدتِ ملازمت میں مزید دو سال کی توسیع کر دی گئی۔ اس وقت سے لے کر مارشل لا کے نفاذ تک کے جو واقعات انہوں نے بیان کیے ہیں ان کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی قوت اور طاقت میں ہر آن اضافہ ہو رہا ہے، ہر صاحبِ اقتدار اُن کا دست نگر ہے، اور حکومت کا بڑے سے بڑا عہدہ دار اُن کی بات کو ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اب اُن کے لہجہ میں بھی فرق نظر آتا ہے اور وہ اس وقت کے برسرِ اقتدار لوگوں کو کڑی کھری باتیں سنانے کے عادی

ہو رہے ہیں۔

جولائی ۵۸ء میں ملک فیروز خاں نون وزیر اعظم نے کراچی میں سیاسی رہنماؤں کی ایک کانفرنس کر کے انتخاباتِ عام کے لیے فروری ۵۹ء کی تاریخ طے کر دی مگر جناب ایوب خاں صاحب کو اس بات کا پختہ یقین ہو چکا تھا کہ سیاست دانوں کے ہاتھ میں ملک کا مفاد محفوظ نہیں ہے اور ملک تباہی کے گڑھے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے اب کوئی زبردست اقدام ہی کرنا چاہیے یہی رائے صدر سکندر مرزا کی بھی تھی۔ اس نے ایوب خاں صاحب کو مطلع کر دیا کہ ساری صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے اور اس نے کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ ۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو وہ کراچی پہنچ کر سکندر مرزا سے ملے اور اس سے پوچھا "جناب، کیا آپ نے اس انتہائی اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے"؟ اُس نے کہا "ہاں"! ۔ بالآخر سات اکتوبر کو رات کے ۸ بجے اُس شخص نے بالکل ڈرامائی انداز میں دستور کو ختم کیا، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑا اور مارشل لا کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ ایوب صاحب نے سکندر مرزا سے کہا "تم نے ایک اقدام کیا ہے اور میرے خیال میں بالکل درست کیا ہے، مگر میرے پاس اس کی تحریر تو ہونی چاہیے"۔ وہ پہلے تو کچھ لیت و لعل کرتا رہا مگر آخر کار مان گیا اور دو یا تین دن گزار کر اس نے تحریری حکم دے دیا۔ مارشل لا کے نفاذ کے چند روز بعد سکندر مرزا صدارت سے سبکدوش کر دیا گیا اور اُس نے انگلستان کی راہ لی۔ اس مقام پر ایوب صاحب کا بیان کچھ اتنا مجمل ہے جس سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ اس انقلاب کا منصوبہ دراصل کس کا تھا۔ ان کے پچھلے بیانات سے ہر ناظر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس اقدام کی ضرورت وہ خود محسوس کر رہے تھے۔ اور یہ بھی کہ حالات کو بگاڑنے والے سیاست دانوں میں ان کے نزدیک سکندر مرزا خود پیش پیش تھا۔ لیکن یہاں انہوں نے واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ کرنے والا صدرِ ریاست تھا اور انہوں نے اس کے ماتحت کمانڈر انچیف ہونے کی حیثیت سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ تاریخ کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ ایوب صاحب اپنی کتاب کے اس حصے کو زیادہ وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے۔

صدر ایوب صاحب اگرچہ فوج کے سربراہ تھے مگر وہ اکثر سیاسی، دستوری اور مذہبی مسائل پر سوچتے رہتے تھے۔ ان مسائل کے بارے میں اُن کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ ممکن ہے بعض حضرات کو اُن کے اس طرزِ فکر پر استعجاب ہو مگر اُن کے دستور اور آئیڈیالوجی والے باب کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۹۵۸ء کے انقلاب سے بہت پہلے اپنے ذہن میں قوم کے سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور معاشی رجحانات کو خاص نہج پر ڈھالنے کا ایک جامع نقشہ بنا چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس باب میں بتایا ہے کہ انہیں ۱۹۵۴ء ہی میں اس بات کا اندیشہ لاحق تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد کہیں انہیں سیاست کی خارزار وادی میں اُلجھنے کے لیے مجبور نہ کر دیں۔ اس بنا پر انہوں نے اسی وقت سے ملک کی تعمیر و ترقی کا ایک واضح نقشہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس نقشے کا ذکر انہوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا ہے۔ ۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو وہ انگلستان کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ انہوں نے ملک کی سیاسی صورتِ حال پر غور و فکر کرنا شروع کیا اور چند گھنٹوں کی کاوش کے بعد قومی تعمیر و ترقی کا ایک جامع منصوبہ ایک تحریری دستاویز کی صورت میں تیار کر لیا۔ اس منصوبے کے چند اہم نکات یہ تھے:

- پاکستان کے باشندوں کی سعی و جہد کا منتہائے مقصود ایک طاقتور، مضبوط اور مربوط قوم بننا ہے۔ ص ۱۸۶
- پاکستان کے سیاسی نظام میں بنیادی خامی یہ ہے کہ یہاں قوت و طاقت کا کوئی ایک مرکز نہیں ہے۔ ہم نے خواہ مخواہ غیر ملکی پارلیمانی نظام کو اپنے ہاں رائج کر لیا ہے۔ ص ۱۹۲۔ ملکی استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ صدر کو ملک کے اندر قوت و اقتدار کا واحد حامل بنایا جائے اور صوبوں اور مرکز میں جہاں اسے کوئی خرابی پیدا ہوتی نظر آئے اُسے درست کرنے کے وہ پورے اختیارات رکھتا ہو۔ ص ۱۹۰

اس ضمن میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ صدر ایوب صاحب کے اس طرزِ فکر کی تائید سر آغا خاں نے بھی کی تھی جن کے ساتھ اُن کے قریبی مراسم تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ سر آغا خاں کی مجھ سے اکثر خط و کتابت رہتی اور خاص طور پر جب میں انگلستان میں ہوتا تو وہ مجھے ملنے کی دعوت دیتے۔

ایک مرتبہ جب میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا :

> "اگر تم لوگوں نے پاکستان میں پارلیمانی نظام کو رواج دینے کی کوشش کی تو یہ ملک تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں نے آپ کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ یہ بات آپ سے کہہ دوں کہ اس نظام کی وجہ سے پاکستان ہاتھ سے جائے گا اور آپ ہی وہ واحد آدمی ہیں جو اسے بچا سکتے ہیں"۔ (ص ۱۹۳)

آغا خاں کی اس گفتگو سے ٹھیک یہ پتہ نہیں چلتا کہ آیا انہوں نے یہ رائے جناب ایوب خاں صاحب کی غیر معمولی قابلیت دیکھ کر ظاہر کی تھی یا اس بنا پر انہیں اپنی تجویز کا مخاطب بنایا تھا کہ وہ اس وقت کمانڈر انچیف تھے اور فوجی طاقت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ بہر حال اس سے یہ بات واضح ہے کہ جناب ایوب خاں صاحب ابتدا سے یہ رائے رکھتے تھے کہ ملک میں پارلیمانی نظام کے بجائے ایسا صدارتی نظام قائم ہونا چاہیے جس میں اقتدار صدر کی ذات میں مرکوز ہو، اور سر آغا خاں نہ صرف اس تجویز کے پُر زور مؤیّد اور محرّک تھے، بلکہ انہیں یہ بھی بتا چکے تھے کہ یہ کام صرف وہی کر سکتے ہیں۔

ان سب حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے عقل یہ باور نہیں کرتی کہ ۱۹۵۸ء کا انقلاب جناب محمد ایوب خاں صاحب کے منشا کے خلاف یا اس کے بغیر برپا ہُوا تھا اور انہیں مجبوراً اس وقت کے صدر کا حکم مانتے ہوئے یہ ذمّہ داری سنبھالنی پڑی۔

دستور اور نصب العین والے باب میں خصوصًا، اور پہلے صفحات میں عمومًا یہ حقیقت واضح انداز میں سامنے آتی ہے کہ وہ اُن فوجی افسروں میں سے نہ تھے جن کی دلچسپیاں صرف اپنے دفاعی کام تک محدود ہوتی ہیں اور اس ایک کام کے سوا انہیں کسی دوسری چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگرچہ امر واقعہ یہ ہے کہ جب پاکستانی کمانڈر انچیف کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا اور لیاقت علی خاں مرحوم نے اس کے متعلق فوج کے سینیئر افسروں سے اس ضمن میں رائے دریافت کی تھی اس وقت ایوب صاحب نے یہ جواب دیا تھا کہ ان کی رائے میں فوج کے افسر کا کام اپنی پوری قابلیّت کے مطابق خدمت کرنا ہے اور فیصلہ کرنا اس سے بالاتر لوگوں کا کام ہے (ص ۴۳)۔ لیکن انہوں نے اپنے ذہنی افق کو اس حد تک محدود نہیں رکھا۔

وہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی مسائل پر نہ صرف پوری سنجیدگی سے سوچتے رہے بلکہ اس فکر کے نتیجے میں تعمیر کا جو نقشہ ان کے ذہن میں بنا تھا اسے عملی جامہ پہنانے کا عزم بھی وہ رکھتے تھے۔ مارشل لا کے نفاذ سے کئی سال پہلے ۱۹۵۴ء میں انہوں نے جو منصوبہ مرتب کیا تھا وہ محض ایک خیالی منصوبہ نہ تھا بلکہ اسی کے مطابق وہ پاکستان کی تعمیرِ نو کرنا چاہتے تھے۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑنے کے بعد جب انہیں کابینہ میں وزیرِ دفاع کی حیثیت سے شامل کیا تو انہوں نے اُس سے اور اپنے کابینہ کے ساتھیوں سے صاف کہا کہ مَیں اسی صورت میں یہ پیش کش قبول کر سکتا ہوں کہ ہم کوئی تعمیری کام کریں۔ جب اس کام کی نوعیت کے بارے میں مجھ سے سوال کیا گیا تو میں نے ۱۹۵۴ء کا منصوبہ اُن کے سامنے پیش کر دیا کہ یہ ہے میرا پروگرام (ص ۱۹۲)۔

سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی معاملات میں غور و فکر کسی کے لیے بھی شجرِ ممنوع نہیں ہے۔ ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملکی تعمیر و ترقی کا جو تصور اپنے سامنے رکھتا ہے اس کے مطابق پروگرام بنائے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔ بلاشبہ اپنے ملک اور اپنی ملت کے ساتھ جناب محمد ایوب خاں صاحب کی محبت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ پوری دلسوزی اور جمعیتِ خاطر کے ساتھ ان امور پر غور و فکر کرتے، ان کے لیے ایک پروگرام مرتب کرتے اور اسے عمل میں لانے کی سعی فرماتے۔ مگر اس مقصد کے لیے صحیح راستہ وہی ہے جو ہر داعی اور مفکر کو اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی نشر و اشاعت کے سارے ذرائع کام میں لا کر قوم کو اپنے افکار و نظریات سے روشناس کرایا جائے اور دلائل کے زور سے لوگوں کو اس بات کا قائل کیا جائے کہ اُن کی فلاح کا راز ان افکار کو اپنانے اور انہیں عملی جامہ پہنانے میں مضمر ہے، پھر جب عام رائے اس پروگرام کے حق میں ہموار ہو جائے تب عوامی تائید سے سیاسی اختیارات حاصل کر کے ان افکار و تصورات کے مطابق قومی زندگی کی تشکیل کی جائے۔

جناب محمد ایوب خاں صاحب خود بھی اصولاً اِس بات کے قائل ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ قوت کے زور سے لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں تغیرات نہیں لائے جا سکتے۔ چنانچہ اپنی کتاب میں ایک جگہ

فرماتے ہیں:

"تم جابرانہ اقدامات کے ذریعہ سے معاشرتی رجحانات کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ جبر کے بطن سے مزاحمت جنم لیتی ہے اور اس لیے تمہیں ہر وقت اپنے اقدام کو شدید سے شدید تر بنانا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ سنگین قسم کے استبداد اور پیہم قوت کے استعمال کی شکل میں رونما ہوتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ معاشرتی رجحانات کو بدلنے اور انہیں مخصوص انداز پر ڈھالنے کے لیے تعلیم و ترغیب ہی واحد ذریعہ ہے۔" (ص۳)

ہمیں یقین ہے کہ اگر جناب ایوب صاحب اصلاحِ احوال کے لیے یہی راستہ اختیار کرتے جس کی انہوں نے خود نشاندہی کی ہے اور اسی اصول کو مدِ نظر رکھ کر جو انہوں نے خود بیان فرمایا ہے اس طریقہ سے انقلاب لانے کی کوشش کرتے جس سے ایک فطری اور مستحکم انقلاب رونما ہوا کرتا ہے تو زیادہ بہتر ہوتا اور ان الجھنوں سے بھی انہیں سابقہ نہ پیش آتا جن کا انہوں نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ملازمت کے ساتھ، خصوصاً فوجی ملازمت کے ساتھ یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔

انقلاب سے پہلے کے جن خراب حالات پر صدر صاحب نے بڑے درد کے ساتھ اپنے رنج و غم کا اظہار کیا ہے، ان میں دوسری بہت سی باتوں کے ساتھ ایک یہ بھی ہے:

"لیاقت علی خاں کی وفات اور ۱۹۵۸ء کے درمیان کا دور بڑی پریشانی کا دور تھا۔ نہ صرف مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں سے برسرِ پیکار تھی بلکہ خود مرکزی حکومت میں بھی بہت کچھ سازش اور جیتپلش کا چکر چل رہا تھا۔ سول ملازمین میں سے ایک شخص جو آزادی کے وقت مالیات کا وزیر بنایا گیا تھا، اُچک کر گورنر جنرل کے منصب پر پہنچ گیا۔ ایک دوسرا شخص جو حکومت کا سکرٹری تھا (اور یہ بھی سول ملازمت ہی کا ایک منصب ہے) راتوں رات وزیرِ مالیات بن گیا۔ ان کے دفتروں کے آگے لگی ہوئی تختی پر بس ان کے عہدے کا نام تبدیل کر دینے کے سوا اور

(باقی ص ۵۶ پر)